فکرِ اقبال اور انسانیت پسندی
(فردی اور اجتماعی مثالیت کے تناظر میں)

ڈاکٹر محمد عالم خاں
Dr. Muhammad Alam Khan
Associate Professor, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

ABSTRACT:-

"Love of humanity reflects peace, freedom and love for humanity. The stated points have been highlited in the underconsideration topic/essay. And this fact is explained that art and thought of Iqbal should be evaluated in ideological and spiritual perspectives, that unfortunately has not atrracted much the attention of literary critics. Therefore criticism on Iqbal needs to be reviewed afresh".

یوں تو ہندوستانی شعر و ادب کو بہت سے کاملینِ فن میسر آئے مگر جو لب و لہجہ، تاثیرِ کلام، رفعتِ خیال اور پروازِ فکر اقبال کے حصے میں آئی وہ کسی اور کا مقدر نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ اقبال کا وہ طرزِ کلام ہے کہ جس نے جدتِ افکار اور ندرتِ خیال کے ساتھ ساتھ دردِ دروں اور سوزِ جنوں کا ساتھ کبھی نہ چھوڑا۔ کیونکہ ان کے نزدیک عقل کی حیثیت فقط چراغِ راہ کی سی ہے، جسے منزل سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ تعقل پسندی، استدلالیت اور منطقیت کے خلاف یہ ردِ عمل یورپ میں بھی اپنی جڑیں پھیلا چکا تھا۔ مگر اقبال کے اس ردِ عمل کو ہندوستان کے مقامی، تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی حالات کے زیرِ اثر بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر پنپتی، اس ادبی فضا میں رومانیت کا وہ بیج بویا کہ جس نے داخلیت نگاری کے اس شجرِ سایہ دار کی صورت اختیار کی اور جس کی چھاؤں میں آئینہ دگان نے آئینہ ادب میں فرد کی باطنی جہات کو مکمل طور پر منعکس کیا مگر یہ فردی انفرادیت یا انسان مرکزیتی اقبال کے یہاں دو حصوں میں بٹی نظر آتی ہے۔ جہاں وہ کبھی تو فرد کی ذات کے موضوعِ سخن بناتا ہے اور کبھی وہ اس فرد (انسان) کی وحدت کو اجتماعیت کے تناظر میں زیرِ بحث لاتا ہے۔ جہاں بطور معاشرتی انگ، جب تک یہ انسان اخلاقی، فکری اور شعوری گراوٹ کا شکار ہے تب تک اجتماعیت میں اعلیٰ اقدار کا حصول ناممکن ہے۔

اس انسان دوستی اور انسان مرکزیتی کے تناظر میں اقبال کا تمام کام اور کلام کسی نہ کسی صورت

فرد کی ذات کے ساتھ ہی منسلک ہے۔ جہاں اقبال کا تصورِ انسان، حرّیت، آزادی اور خود مختاری کا حامل ہے۔ جو اپنی ذات کو شناخت دینے کیلئے انتخاب اور چناؤ پر قادر ہے۔ یہ شناخت، پہچان دراصل اس جوہر کا حصہ ہے جو اپنے لیے اچھے برے خواص کا تعین خود کرتا ہے۔ اس آزادی کے ساتھ ساتھ اس پر ایک ذمہ داری کا احساس بھی غالب آتا ہے۔ یوں اقبال بھی انسانی آزادی کا علمبردار ہے اور اس احساسِ ذمہ داری کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے جو عمل کی طرف راغب کرتی ہے۔ ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
(جاوید نامہ)

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
(طلوعِ اسلام از بانگ درا)

اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انسان نہ روح ہے نہ بدن
(آدم از ضربِ کلیم)

''میں ہی تو اک راز تھا سینۂ کائنات میں'' کے نعرے بلند کرتا اور ''عروجِ آدمِ خاکی'' کے گن گاتا اقبال، کبھی اسے قلندر سے تعبیر کرتا ہے تو کہیں فردِ کامل سے، مگر ان تمام اصطلاحات کے پس پردہ وہ بشریت کی فوقیت کا قائل نظر آتا ہے۔ کہیں وہ زمین و آسمان کی اس بیکرانی کو اس بشر کی اک جست کے درمیانی فاصلے تک محدود کرتا ہے تو کبھی اسے تقدیر بدلنے والے اور جاودانی جیسی صفات کا مظہر قرار دیتا ہے۔ اسی عظمت و بڑائی اور حرمتِ انسانی کی فکر کے پیشِ نظر، اقبال مولانا رومؒ اور نطشے کے خیالات سے متاثر نظر آتا ہے۔ اسرارِ خودی پر بات کرتے ہوئے لوز ڈکنسن (Lows Dickinson) کہتے ہیں کہ:

"But the strongest influence is Nietzsche the doctrine of hardness, of individuality of the need to conflict, and the benefit of an enemy run all through the Poem."(1)

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال جو کہ مذہبی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے اور ماورائیت، الٰہیاتی اور مذہبیاتی فلسفے کا علمبردار ہے۔ مولانا روم تک تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے مگر اقبال جیسا مذہبی

فلاسفر، نطشے جیسے کٹر ملحدانہ نظریات کے حامل فلسفی سے متاثر نظر آتا ہے۔ اور کارل مارکس جیسے فلسفی کو ''کلیم بے تجلی''، ''مسیح بے صلیب' اور ''نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب'' کہتا نظر آتا ہے۔ یہ دراصل اقبال کی اس انسانی دوست فکر کا نتیجہ ہے کہ جس کے زیر اثر وہ ہر اس شخص سے متاثر نظر آتا ہے جو انسانیت کے حق میں آواز بلند کرتا ہے اور انسانی فوقیت کا قائل ہے۔ اس لیے ہیگل بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہیگل کا صدف گہرے سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی
(ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام از ضربِ کلیم)

اقبال کا یہ خود مختار اور خودی کا راز داں انسان، نطشے کے فوق البشر (Super man) کی طرح ایک مثالی حیثیت اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ فلسفیانہ روایت میں کلاسیکی مکتبہ ہائے فکر اور جدید مکتبہ ہائے فکر میں اس مثالیت پسندی کی مثالیں ہمیں دوسرے فلسفیوں کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مگر افلاطون کی مثالی ریاست سے نطشے کے فوق البشر تک، یہ مثالیت پسندی دو حصوں میں بٹی نظر آتی ہیں۔ جن میں سے بعض فلسفیوں کے یہاں فرد کو بطور ایک انفرادی اکائی کے زیر بحث لایا گیا ہے اور بعض کے یہاں فرد سے مل کر بننے والی معاشرتی اور ریاستی اکائی کو' اقبال ماورائے شاعر'' میں عامر رؤف خان یوں رقمطراز ہیں:

> ''دنیا میں جتنے بھی بڑے دانشور، فلاسفر اور سکالر آئے ہیں انہوں نے اس دنیا اور اپنے اردگرد کے معاشرے کو اپنی منفرد سوچ اور اپنے الگ نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ اور ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ فی الحقیقت جب ہم اپنی دنیا، اپنے معاشرے یا اردگرد کے ماحول سے مطمئن نہیں ہو پاتے تو ہمارا شعور اور لاشعور ہمیں الگ نئی تصوراتی دنیا بسانے پر آمادہ کرتا ہے۔ جس سے سب کچھ ہماری آرزوؤں کے عین مطابق دنیا بسانے پر آمادہ کرتا ہے۔ جس سے سب کچھ ہماری آرزوؤں کے مطابق ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اس دنیا میں ہم جس چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ وہ کمی ہم اپنی تصوراتی دنیا میں پوری کر لیتے ہیں۔ اور اس وجہ سے کئی نامور فلاسفہ نے اپنی تصوراتی دنیا کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ یہاں اس بات کا ادراک ضروری ہے کہ ان میں بعض نے پوری ریاست کا نظریہ پیش کیا ہے تو بعض نے صرف ایک فرد کا پروگرام۔ یعنی کہیں ہمیں کُل کا تصور ملتا ہے تو کہیں جز دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے افلاطون نے کُل کی شکل میں ہمیں اپنی مثالی ریاست (Republic) کا تصور دیا۔ ارسطو نے ہمیں جُز کی صورت میں مثالی

انسان (Ideal Man) کا تصور دیا۔ عبدالکریم جیلی نے مردِ کامل کا تصور دیا۔ سرتھامس مور نے یوٹوپیا (Uptopia) کا تصور دیا۔ مولانا روم کے ہاں بھی ہمیں کامل انسان کا تصور ملتا ہے۔ نطشے نے ہمیں فوق البشر (Supper man) کا تصور دیا۔ اسی طرح علامہ محمد اقبال نے بھی مردِ مومن کی اصطلاح سے متعارف کروایا۔''(۲)

اس تصوراتی مثالیت پسندی کے تناظر میں جہاں بعض فلسفی کائنات کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں وہیں اقبال مثالی فرد، کو مثالی معاشرے کے جزو کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جدید فلسفیوں کے یہاں فرد کو مرکزیتی اکائی کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور تمام معروض کی تعریف اس فرد کی داخلی اور موضوعی ضروریات اور احساسات کی بنا پر کی جاتی ہے۔ اقبال کے یہاں اس مثالیت پسندی کی حتمی پیداوار اور ماحاصل فرد کی مثالیت پسندی سے ہوتی ہوئی معاشرتی مثالیت پسندی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ان کے نزدیک فرد کائنات کا بنیادی محور ہے ڈاکٹر نکلسن نے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"there can be no ideal society without ideal men:

And for the production of there we revise not only

insight but a motive power, fire as well as light."(3)

فکرِ اقبال کے بارے میں ہمارے اکثر ناقدین تجزیہ کرتے ہوئے ایک بنیادی غلطی کر رہے ہیں کہ وہ فکرِ اقبال کو کسی ایک مغربی مفکر کی بیساکھی قرار دے کر اس کی فنی عظمت کا اظہار کرتے ہیں جبکہ یہ بات پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اقبال کا تصورِ مثالی انسان کے سلسلے میں بہت مختلف ہے۔ اقبال کا مثالی فرد اپنے خارجی تشخص میں اپنی تمام تر روایات اور عقائد کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور ایک تہذیبی قوت کے طور پر پوری انسانیت کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ویسے بھی اقبال کے ہاں اشیاء بہت واضح، قدرے ٹھہری ہوئی اور زمین پیوست دکھائی دیتی ہیں لیکن تخیلی اور تخلیقی طاقت کے بل بوتے پر تصورِ زمان و مکان کی علامت بن کر پوری عالمِ انسانیت کے لیے ایک معتبر تہذیبی و روحانی حوالہ قرار پاتا ہے۔ یوں اقبال کے ہاں مثالی معاشرے کی تعمیر و تشکیل اور اس کا فکری و نظریاتی ابلاغ ایک ایسے فرد سے جڑا ہوا ہے جو بیک وقت اپنے عقائد و روایات کے زینے پہ کھڑا ہے جبکہ اس کی خیال آفرینی فکر کی عظیم تر بلندیوں پر جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ اس درجے پر فائز ہو کر وہ فرد کسی ایک قوم کا فرد نہیں ہوتا بلکہ وسیع تر انسانی قدروں کا ترجمان ہوتا ہے اور فکرِ اقبال کے ہاں اس فرد کی تعمیر اور تلاش کا عمل بیک وقت جاری و ساری رہتا ہے اور یہ فکری بازیافت اقبال کو ان عظیم ترین فلسفیوں سے منسلک کر دیتی ہے جو انسانیت کے لیے عظیم اثاثہ ہیں۔ واضح رہے کہ یہ عالمگیریت کا وہ بلند ترین منطقہ ہے جس میں ہمارے ناقدین نے اترنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اقبال کی فکری تفہیم کو ادب کی سطح پر بہت

محدود خانوں میں تقسیم کر دیا ہے اور جس پر شارحینِ ادب کو از سرِ نو غور کرنا ہوگا۔ اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جون ایلیا لکھتے ہیں:

> ''صورت یہ ہے کہ ان کی مخصوص تعلیمات اور فلسفۂ حیات سے ہر شخص متفق نہیں ہوسکتا لیکن ان کی شاعری، ان کے فن کی جمالیاتی اقدار اور ان اقدار کے پیچھے زندگی کی جو امنگیں بال کشا ہیں ان کے عظیم حسن و جمال سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا لیکن اس پہلو کی طرف توجہ کرنے کی بجائے ان کے کلام کی اخلاقی ،فقہی، سیاسی اور روحانی توجیہات پر سارا زور صرف کر دیا جاتا ہے ۔ وہ توجیہات جو ایک غیر متعلق قاری کے لیے کوئی جاذبیت نہیں رکھتیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقبال ایک ہی حلقے میں محدود ہو کر رہ جاتے ہیں جب کہ ان کے فن کی اپیل عالم گیر ہے ۔ اگر دنیا کے عظیم شاعروں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور ہم سے پوچھا جائے کہ اس فہرست مرتب کی جائے اور ہم سے پوچھا جائے کہ تم اس فہرست میں اردو کی طرف سے کن شاعروں کے نام شامل کرو گے تو ہم بلا تامل جن شاعروں کے نام لیں گے ان میں اقبال اور غالب سرِ فہرست آتے ہیں ۔ اب اس کے بعد جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلامی فقہ کی تشکیل جدید اور احیائے ملت کی تحریک کے ضمن میں تو اقبال کے تمام اجتہادات گنائے جا رہے ہیں مگر ان کی شاعری کا کوئی ذکر نہیں تو ہمیں تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔''(۴)

جون بھی تفہیم اقبال کے سلسلے میں اپنے ہم عصر ناقدین سے نالاں نظر آتے ہیں کہ جنھوں نے اقبال کو چند مذہبی، سیاسی اور فروہی نظریات تک ہی محدود کر دیا ہے ۔ حالانکہ وہ ایک آفاقی اور عالمگیری افکار کے حامل فلسفی تھے۔ جنھوں نے مختلف فلسفیوں، ادیبوں اور شاعروں کے یہاں فکر و فن کی مختلف جہتیں دریافت کیں اور مختلف نظریات کشید کیے۔ مگر جب اقبال کے یہاں موجود ان نظریات کی تفہیم و تشریح کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہیں خالصتاً اسلامی روایات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی گئی مثلاً خودی، جسے نطشے Self کے طور پر بیان کرتا ہے، کے ساتھ جبریہ نظریات یا مجبوری ءمحض جیسے نظریات کو منسوب کر دینا اس فلسفہ خودی کے ساتھ ناانصافی ہے۔

اقبال جب خودی کی بات کرتا ہے تو اس سے مراد وہ شخصی یا ذاتی شعور ہے جو انسان کا جوہر ہے۔ انسان ان خصائل اور عادات و اطوار کا چناؤ خود کرتا ہے۔ اس چناؤ اور انتخاب کے عمل میں انسان کا وجود جامع خصائل اور عالمگیر خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے ۔ چاہے وہ علم کے موتی یورپی معاشرت کا حصہ ہوں یا کہ پھر ماضی کی گم گشتہ روایات کا۔ انسان کو اس ارتقائی شعور اور ارتقائی تہذیب و تمدن سے کلی

طور پر پہلو تہی نہیں کرنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنے قارئین کو کبھی تو ماضی کی روایات سے پیوستہ رہنے کی نصیحت کرتے ہیں اور کبھی اس روش سے پہلو تہی کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال اندھی تقلید کا حامی نہیں ہے۔ بلکہ انتخاب کا طرفدار ہے۔

یورپ کے سفر کے دوران اقبال نے یورپی معاشرت، رہن سہن، تہذیب و تمدن اور اخلاقیات کو قریب سے دیکھا۔ اور کسی حد تک ان سے اثر بھی قبول کیا۔ اور اس معاشرے کی خوبیوں خامیوں کا بھی بغور جائزہ لیا۔ فلسفے اور ادب سے تو انہیں پہلے سے ہی شغف تھا۔ مگر یہ خوب سے خوب تر کی تلاش ہی تھی کہ جو انہیں یورپ تک لے آئی۔ ''التجائے مسافر'' میں اس کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں۔

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
(التجائے مسافر از بانگِ درا)

مگر اس جدید ماحول، معاشرت اور خیالات و نظریات سے آشنائی کے باوجود اقبال کے پیشِ نظر ہندوستان کے مسلمانوں کی تہذیبی، معاشی، فکری اور نظریاتی اصلاح تھی۔ اس مسلم قوم پرستی اور اصلاح پسندی کے سبب بعض ناقدین اقبال کی فکری اور فلسفیاتی سطح کو محدود قرار دیتے ہیں۔ اور بطور شاعر بھی اسے ایک بڑا شاعر ماننے سے انکاری ہیں مگر اقبال کی اس مشرقی روایات، تہذیب و تمدن اور فکری اساس سے جڑے رہنے کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اپنے اس مشرقی لب و لہجے اور اندازِ بیان کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

> ''مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، مرزا عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اول الذکر دو صاحبان (ہیگل اور گوئٹے) نے مجھے اشیا کے باطن سے روشناس ہونا سکھایا۔ (مرزا غالب اور مرزا بیدل) سے میں نے یہ سیکھا کہ شاعری کے غیر ملکی تصورات و اقدار سے کامل آشنائی کے باوجود روحِ مطالب اور اندازِ بیان میں کس طرح مشرقی رنگ دیا جا سکتا ہے۔ اور موخر الذکر (ورڈز ورتھ) نے مجھے ایامِ طالب علمی میں دہریت سے بچایا۔''(۵)

ان پانچوں صاحبان (ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، مرزا عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ) سے اکتسابِ فیض کے اعتراف کے بعد وہ مرزا غالب اور مرزا عبدالقادر بیدل کو ان مشرقی روایات اور لہجے سے جڑا رہنے کا محرک قرار دیتے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ ان دیگر وجوہات کو بھی محرک کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔

i۔ ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے بعد مسلم قوم بطور مفتوح، علمی، فکری، سیاسی، تہذیبی اور

معاشرتی پسماندگی۔

ii۔ مسلم لیگ سے اقبال کی سیاسی وابستگی۔

iii۔ مسلم اور ہندو قوم کی الگ الگ سیاسی نمائندہ جماعتوں کا قیام۔

iv۔ اقبال کے عہد کی سماجی، معاشی، فکری، سیاسی اور تہذیبی ساخت۔

v۔ جنگِ عظیم اول اور تقسیمِ ترکی کے بعد خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ۔

ہر چند کہ اقبال کا لہجہ اور رومانوی تھا مگر اقبال جیسے صاحب شعور اور مفکر پُرمغز کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے معروضی حالات سے اثر قبول کرے اور خواب و خیال سے نکل کر اس عہدِ زبوں حال میں مقصدیت کی مشعل بلند کیے رکھے۔ اور اس مقصد کے حصول کیلئے کبھی تو اقبال انہیں ان کے روشن ماضی کے قصے سناتے نظر آتے ہیں تو کبھی فلسفہءِ خودی کی صورت میں فکر و عمل کیلئے آمادہ کرتے نظر آتے ہیں۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن ، اپنا تو بن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
(بالِ جبریل)

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
(بالِ جبریل)

اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ''فکرِ اقبال'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اقبال نے مغرب میں حقیقت حیات سے جو بیگانگی دیکھی، وہی محرومی اس کو مشرق میں بھی اور ملتِ اسلامیہ میں بھی نظر آتی ہے، جہاں قیس اس لیے پیدا نہیں ہو رہے کہ صحرا میں وسعت نہیں اور محمل میں لیلیٰ نہیں، یعنی دل و دماغ کے سامنے کوئی مقصود اور نصب العین نہیں جو قلب کو گرما سکے اور روح کو تڑپا سکے۔ ظاہری خول اور چھلکے نظر آتے ہیں جن کے اندر مغز نابود ہے۔ تیر ترکش کے اندر نہیں، یا ہیں تو نیم کش ہیں، کیونکہ صیاد کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کس ہدف کی طرف ان کو چلایا جائے؟ دینی زندگی کے کچھ ظواہر ہیں جو بے گوہر صدف ہیں۔ منہ سے توحید کا کلمہ پڑھنے والے طرح طرح کی بُت گری اور بُت پرستی میں مبتلا ہیں۔ دیر کے نقش و نگار میں کھوئے خدا اور خودی سے غافل ہو گئے ہیں۔

جب ملتِ اسلامیہ کی اپنی یہ حالت ہے تو ملت مغربیوں کی بے دینی پر کس منہ سے معترض ہوسکتی ہے؟ ملا اور صوفی اور سیاسی رہنما اور دولت میں مست افراد سب کا یہی حال ہے۔ مغربیوں نے کم از کم وہ کچھ تو کر دکھایا جو خرد کے بس کی چیز تھی۔ مشرق میں تو روحانیت کے ساتھ عقلیت کا بھی فقدان ہے مغرب کو تو اپنی اصلاح کے لیے فقط اپنی عقلیت اور مادیت کی ترقی یافتہ صورتوں کو روحانیت کے زیرِ نگین لانا ہے، لیکن مشرق کو اپنے باطن کے ساتھ ظاہر کی درستی کا کام بھی کرنا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں مشرق و مغرب سے بہت پیچھے رہ گیا ہے، مغرب کو جتنی اصلاح کی ضرورت ہے اس سے بدر جہا زیادہ مشرق اور ملتِ اسلامیہ اس کی محتاج ہے''۔(۶)

میر سپاہ نا سزا لشکریاں شکستہ صف
آہ! وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف
تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف
عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگار دیر میں خون جگر نہ کر تلف
(بالِ جبریل)

اقبال اپنی اسی انسان دوستی اور دردمندی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری
(تصویر درد از بانگ درا)

فکرِ اقبال کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ فرد کو کائنات میں مرکزی حیثیت دی جائے، اسکے لیے ضروری ہے کہ فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے نمایاں کیا جائے لیکن المیہ یہ ہے کہ کہ ہم نے اقبال کی فکر کو غیر ضروری تضادات اور فلسفیاتی موشگافیوں میں الجھا دیا ہے، جس کے نتیجے میں اقبال کے افکار و نظریات کو ایک مکمل اکائی کے طور پر سمجھنے اور پرکھنے کی روایت نہیں رہی اور اقبال مختلف گروہوں، صف بندیوں اور متضاد و متحارب طبقات میں بکھرا پڑا ہے۔ اس سارے عمل کو ایک مربوط فکری دھارے میں تبدیل کرنے کا محض ایک ہی راستہ ہے کہ اقبال کی تخلیقات اور نظریات کو صرف انسانیت اور انسان دوستی کی بنیاد پر پرکھا جائے۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جہاں تمام مذاہب، افکار اور عقائد ایک دھارے میں آ کر مدغم ہو جاتے ہیں اور اقبال نہ صرف معاشرتی اور سماجی

اقدار کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ اپنی تہذیبی طاقت اور تخیّلاتی قوت کی بنیاد پر بن کر آفاقی قدروں کے علمبردار دکھائی دیتے ہیں اس سلسلے میں ضروری ہے کہ اقبال سے متعلق طے شدہ نتائج سے ہٹ کر عہدِ جدید کے تناظر میں از سرِ نو تجزیہ کیا جائے کہ ان کے افکار و نظریات میں سائنٹیفک شعور اور روحانی اقدار کس طرح جگہ پاتی ہیں اور وہ اکیسویں صدی میں سانس لینے والے فرد کی ذہنی و فکری تربیت اور نشوونما میں کیا کردار ادا کر سکتی ہیں۔

حوالہ جات

1. Khorram Ali Shafirve, Iqbal in the mind of Europe, Iqbal Review, April-October 2010, P32.

۲۔ عامر رؤف خاں، اقبال، ماورائے شاعر، مضمون مشمولہ: اقبالیت، جنوری ۲۰۱۳ئ، ص:۹۹

3. Khurram Ali Shafique, Iqbal in the mind of Europe, Iqbal Review, Apr/Oct.2010, P-51.

۴۔ جون ایلیا، اقبال اور اقبال اکیڈمی، مضمون مشمولہ: فرنود، مرتب: خالد احمد انصاری، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، س ن، ص:۱۵۲

۵۔ بحوالہ، اسلم انصاری، ڈاکٹر، شعر و فکرِ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۵ئ، ص:۹۷

۶۔ عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، فکرِ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۳ئ، ص:۱۷۴

☆.....☆.....☆